فکر و نظر۔۔۔ اسلام آباد جلد:۳۸ شمارہ:۳

مولانا حمیدالدین فراہی اور سیّد سلیمان ندوی

ابو سفیان اصلاحی ☆

علامہ شبلی نعمانی کے خاص تربیت یافتہ تلامذہ میں مولانا حمید الدین فراہی (۱۸۶۳-۱۹۳۰ء) اور مولانا سیّد سلیمان ندوی سرخیل کے مانند ہیں اور دونوں ہی شخصیتوں نے مختلف علمی میدانوں میں کام کرتے ہوئے اپنے استاذ محترم کی علمی روایت کو نہ صرف آگے بڑھایا بلکہ اسے مزید استحکام بخشا۔ علامہ شبلی نعمانی نے آخری ایام میں اپنی تمام تر توجہ کا مرکز دارالمصنفین اور مدرسۃ الاصلاح کو بنایا، ان کا خیال تھا کہ ان دونوں کے اجتماع و اتحاد سے ایک جامعہ اسلامیہ کا قیام عمل میں آ سکتا ہے۔[۱] چنانچہ استاد گرامی کی اس آخری خواہش کے سبب مولانا حمید الدین فراہی نے دارالمصنفین[۲] اور مدرسۃ الاصلاح[۳] کی نشوونما کے لیے غیر معمولی کد و کاوش سے کام لیا اور مولانا سیّد سلیمان ندوی نے اپنی تمام تر توانائی دارالمصنفین کو ایک عالمی ادارہ بنانے میں صرف کر دی اور قدم قدم پر علمی اور ادارتی معاملات میں اکیڈمی کے صدر نشین مولانا حمید الدین فراہی سے مشورے لیتے رہے۔ اور اسی کے ساتھ ساتھ دنیا کے سامنے اپنی نجی محفلوں، مکاتیب، تصانیف اور معارف کے شذرات میں مولانا فراہی کے علم و فضل، زہد و تقویٰ اور طبیعت کی بلندی و عظمت کردار کا نہایت عقیدت اور نیازمندی کے ساتھ ذکر کرتے رہے اور ان کے وجود کو اپنے لیے نعمت غیر مترقبہ تصور کرتے تھے۔ یہ کہنا شائد مبالغہ نہ ہوگا کہ سیّد صاحب کی علمی تعمیر میں علامہ نعمانی اور مولانا فراہی کا نہایت اہم رول ہے۔ سیّد صاحب مولانا کو قدر و منزلت کی نظروں سے دیکھتے اور انہیں ہر طرح کا اعزاز و اکرام دینے میں کوئی کسر نہ چھوڑی، انہیں اپنے بزرگوں میں شمار کرتے اور مختلف چیزوں میں ان سے اپنے استفادے کا ذکر کرتے۔[۴] صباح الدین عبدالرحمان صاحب لکھتے ہیں، مولانا حمید الدین فراہی بی-اے کا

☆ شعبہ عربی، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

بھی بہت احترام کرتے تھے۔ چنانچہ ان سے قرآن پاک اور فلسفہ جدیدہ کے سبق تو کم ہی پڑھے مگر صحبت بار بار اٹھائی اور مشکلات میں مشورے بار بار کیے۔ سیرت کی تیسری جلد میں جو معجزات پر ہے، ان ہی کے فلسفہ کی تقلید ہے۔(۵) مولانا عبدالباری ندوی کا خیال ہے کہ سیّد صاحب پر مولانا فراہی کے اثرات تھے۔(۶) ایک تو ان کی علمیت کی وجہ سے اور دوسرے سیّد صاحب کے مولانا فراہی سے نہایت ذاتی اورنجی تعلقات تھے۔(۷) اس مضمون میں ہم یہ پیش کرنے کی کوشش کریں گے کہ سیّد صاحب نے کن کن زاویوں سے مولانا فراہی کی علمی وشخصی زندگی کا جائزہ لیا ہے۔

علم وفضل

مولانا حمید الدین فراہی علم وفضل اور ذہانت و ذکاوت کی ان بلندیوں پر فائز تھے کہ جن کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے، سیّد صاحب نے بھی مختلف جگہوں پر مولانا فراہی کی بصیرتوں اور علمی لیاقتوں کو بڑے عقیدت مندانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ سیّد صاحب نے معارف میں مولانا فراہی پر ایک تفصیلی مقالہ تحریر کیا۔ اس کا آغاز ان لفظوں میں ہوتا ہے، اس سے پہلے ہندوستان کے جن اکابر علماء کا ذکر کیا گیا ہے وہ کل وہ تھے، جن کی ولادت اور نشوونما انقلاب زمانہ سے پہلے ہوئی تھی۔ آج سب سے پہلی دفعہ ہم نئے عہد کے سب سے پہلے عالم کی وفات کے ماتم میں معروف ہیں۔ ہم ایک ایسے گریجوایٹ عالم کا ماتم کرتے ہیں جو اپنے علم وفضل، زہد و ورع، اخلاق و فضائل میں قدیم تہذیب کا نمونہ تھا، لیکن جو اپنی روشن خیالی، جدید علوم و فنون کی اطلاع و واقفیت------ اور مقتضیات زمانہ کے علم وفہم میں عہد حاضر کی سب سے بہتر مثال تھا۔ اس سے پہلے ان تمام علماء نے جو نئے علم کلام کا اپنے کو بانی کہتے اور سمجھتے ہیں، جو کچھ کہا اور لکھا وہ دوسروں سے سنی سنائی باتیں تھیں، لیکن اس جماعت میں یہ پہلی ہستی تھی، جس نے فلسفہ حال کے متعلق نفیاً یا اثباتاً جو کچھ کہا اور لکھا وہ اپنی ذاتی تحقیق اور ذاتی علم و مطالعہ سے۔(۸)

رسالہ امعان فی اقسام القرآن، پر سیّد صاحب نے مقدمہ لکھتے ہوئے مولانا فراہی کی مطبوعہ و غیر مطبوعہ کتب کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ: '' جو شخص ان کتابوں کے عناوین پر ایک نظر ڈالے گا وہ یقیناً حیرت و استعجاب میں پڑ جائے گا۔ اور اللہ تعالیٰ نے

صاحب کتب کو وسعت علم، صاف ستھرا ذہن، غیر معمولی لیاقت، اعلیٰ ذوق، ذہنی بیداری، قرآن کریم میں غور و فکر اور اس کے اصول و معانی کے تفہیم کی بلند استعداد اور قرآن کریم کی مشکلات اور قریب الفہم مفاہیم کی بصیرت عطا کی ہے وہ ضرور ان کا معترف ہوگا"۔(۹)

سیّد صاحب نے مولانا فراہی کے انتقال پر معارف کے شذرات میں انہیں جس طرح یاد کیا ہے، اس سے مولانا فراہی سے ان کی گہری عقیدت و وابستگی کا ایک طرف جہاں اظہار ہوتا ہے، وہیں مولانا کی علمی جلالت و شان بھی منظر عام پر آتی ہے، شذرات کا کچھ حصہ یہاں نقل کیا جا رہا ہے تاکہ قارئین مولانا کے علمی وقار و مرتبہ کا اندازہ کرسکیں:۔

> الصلوۃ علی ترجمان القرآن (مفسر قرآن کی نماز جنازہ) وہ صدا ہے جو آج سے ساڑھے چھ سو برس پیشتر مصر و شام سے چین کی دیواروں تک ابن تیمیہ" کی نماز جنازہ کے لیے بلند ہوئی تھی، حق ہے کہ یہ صدا آج پھر بلند ہو اور کم از کم ہندوستان سے مصر و شام تک پھیل جائے کہ اس عہد کا ابن تیمیہ ۱۱رنومبر ۱۹۳۰ء (۱۹ جمادی الثانی ۱۳۴۹ھ) کو اس دنیا سے رخصت ہوگیا وہ جس کے فضل و کمال کی مثال آئندہ بظاہر حال عالم اسلامی میں پیدا ہونے کی توقع نہیں جس کی مشرقی و مغربی جامعیت عہد حاضر کا معجزہ تھی۔ عربی کا فاضل یگانہ اور انگریزی کا گریجویٹ، زہد و ورع کی تصویر، فضل و کمال کا مجسمہ فارسی کا بلبل شیرازہ عربی کا سوق عکاظ، ایک شخصیت مفردہ لیکن ایک جہاں دانش ایک دنیا کے معرفت، ایک کائنات علم، ایک گوشہ نشین مجمع کمال، ایک بے نوا سلطان ہنر، علوم ادبیہ کا یگانہ علوم عربیہ کا خزانہ، علوم عقلیہ کا ناقد، علوم دینیہ کا ماہر، علوم القرآن کا واقف اسرار، قرآن پاک کا دانائے رموز، دنیا کی دولت سے بے نیاز، اہل دنیا سے مستغنی، انسانوں کے رد و قبول اور عالم کی داد و تحسین سے بے بہرا گوشہ علم کا معتکف، اور اپنی دنیا کا آپ بادشاہ، وہ ہستی جو تیس برس کامل قرآن پاک اور صرف قرآن پاک کے فہم و تدبر اور درس و تعلیم میں محو، ہر شئے سے

بے گانہ اور شغل سے نا آشنا تھی۔(۱۰)

قرآنیات

مولانا حمید الدین فراہی کے علم و تحقیق کا اصل میدان علوم قرآن تھا، قرآنیات کی دنیا میں تفکر و تدبر کے ایک نئے دور کا آغاز کیا، جس کی مثال قدیم مفسرین کے یہاں بھی نہیں ملتی، مولانا نے قرآن کریم کے متعدد پہلوؤں پر اظہار خیال کیا اور چند سورتوں کی تفسیر بھی لکھی۔ اب تک مولانا کی تقریباً ۳۹ کتب شائع ہو چکی ہیں(۱۱) اور ۳۳ کتب ابھی زیور طباعت سے آراستہ ہونے سے محروم ہیں۔(۱۲)

سیّد صاحب نے اپنی مختلف تحریروں میں مولانا فراہی کی قرآنی بصیرت پر روشنی ڈالی ہے، اور خود قرآنیات کے سلسلہ میں سیّد صاحب نے مولانا سے استفادہ کیا۔ سیّد صاحب کی قرآنی خدمات میں مولانا فراہی کے اثرات کی جھلک واضح طور پر موجود ہے، جس کا اعتراف سیّد صاحب نے خود کیا ہے، فرماتے ہیں سب سے آخری جلوہ قرآن پاک کا نظر آیا۔ مولانا شبلی مرحوم نے اس کا آغاز کیا اور مولانا حمید الدین فراہی کی دلچسپ و مفید صحبتوں میں یہ چسکا اور آگے بڑھتا گیا اور اسی کا یہ اثر ہوا کہ سیرت نبوی کی ہر بحث میں قرآن پاک میری عمارت کی بنیاد ہے اور حدیث نبوی اس کے نقش و نگار ہیں۔(۱۳)

سیّد صاحب نے مولانا فراہی کی تفسیر سورہ اخلاص سے بھی استفادہ کیا ہے۔ سیرۃ النبی جلد چہارم میں لفظ ''صمد'' کے باب میں سیّد صاحب فرماتے ہیں: '' اس مختصر سورہ میں سب سے چھوٹا لفظ ''صمد'' ہے، لیکن قرآن کی بلاغت نے اس میں صفات الٰہی کا بے پایاں دفتر چھپا رکھا ہے۔ ''صمد'' کے معنی لغت میں اونچی، پتھریلی زمین یا چٹان کے ہیں جو کسی ایسے علاقے میں ہو جہاں جب سیلاب آتا ہو تو اس پر نہ چڑھتا ہو اور لوگ اس وقت اس پر دوڑ دوڑ کر اسی پر چڑھ کر اپنی جانیں بچائیں۔ اس لغوی معنی سے اس سردار کے معنی پیدا ہوئے جو بزرگی اور شرافت میں انتہائی معراج کمال پر ہو اور اس سردار کو بھی کہنے لگے جس کی موجودگی کے بغیر مجلس میں کوئی فیصلہ نہ ہو سکتا ہو اور اس سردار کو بھی کہتے ہیں جس کے اوپر کوئی سردار نہ ہو اور اس جائے پناہ کے معنی میں بھی مستعمل ہوا جو سب کو مصیبت کے وقت اپنے دامن میں پناہ دے سکے اور اس مرکز و موقع کے معنی میں بھی آیا جس کی طرف

ہر شخص دوڑ دوڑ کر جاتا ہے، صمد ٹھوس کو بھی کہتے ہیں جس کے اندر خول نہ ہو، اسی سے اس کو بھی کہتے ہیں جو کھاتا پیتا نہ ہو اور جس کے آل و اولاد نہ ہو، اس کو بھی کہتے ہیں جس سے کوئی بے نیاز نہ ہو، اس بہادر کو بھی کہتے ہیں جس کو لڑائی میں بھوک اور پیاس نہ لگتی ہو۔ ''صمد'' اس اونٹنی کو بھی کہتے ہیں جس کے حمل نہ رہا ہو''۔ (۱۴)

مولانا فراہی نے لفظ ''صمد'' کے لغوی معنی پر اس انداز میں روشنی ڈالی: '' وہ کلمہ ''صمد'' جس کا ترجمہ باہمہ کیا گیا ہے، اصل وضع میں بڑی چٹان کو کہتے ہیں، اور چونکہ دشمنوں کے حملہ کے وقت اس کی پناہ پکڑتے ہیں اس لیے سردار کو جو قوم کی پشت پناہ ہو اور سب لوگ اس کی طرف متوجہ ہوں صمد کہنے لگے، زبور اور دیگر کتب مقدسہ میں خدائے تعالیٰ کو اکثر چٹان، مدد کی چٹان کہا گیا ہے''۔ (۱۵)

سیّد صاحب اور مولانا فراہی کی مذکورہ تحریروں کو دیکھا جائے تو یہ کہنے میں کوئی حرج نہیں کہ لفظ ''صمد'' کی وضاحت میں سیّد صاحب نے مولانا فراہی سے استفادہ کیا ہے، لیکن اسی کے ساتھ ہی ساتھ اس وضاحت میں سیّد صاحب نے بہت کچھ اضافہ بھی کر دیا ہے۔

''احد'' اور ''صمد'' کے باب میں سیّد صاحب فرماتے ہیں: '' احد اور صمد اللہ کے دو صفاتی نام ہیں جو اس کے دو متضاد کمالی اوصاف کو حاوی ہیں، اس کی یکتائی کا نتیجہ تو یہ ہے کہ اس جیسا کوئی نہیں، نہ اس کو کسی کی حاجت، نہ اس کو کسی سے غرض، وہ یکہ و تنہا۔ اکیلا، بے ہمتا، بے نیاز، بے پروا، سب سے مستغنی اور سب سے الگ ہے، لیکن اسی کمال یکتائی کے ساتھ وہ صمد بھی ہے۔ یعنی سب کے ساتھ، سب کا دستگیر، سب کی جائے پناہ، سب کا محتاج الیہ، سب کا مرجع، سب کا ماوئی، سب کا ملجا یعنی سب کی چٹان ہے جو مصیبتوں میں سہارا، بلاؤں میں تسلی اور اضطرابوں میں تشفی ہے''۔ (۱۶)

مولانا فراہی لفظ ''صمد'' کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں: '' خود بے شک بے نیاز ہے، مگر سب کی دستگیری اور خبرگیری کرتا ہے، نصرت اور مدد اور تسلی کا اعلیٰ قبلہ کوئی اس کے سوا ہو ہی نہیں سکتا۔ تمام قوت اور تمام احسان کا سرچشمہ ہونے کے ساتھ جب مانگو عطا کرتا ہے، مانگنے کی خواہش بھی وہی بخشتا ہے۔ یعنی بلوا کر بخشش کرتا ہے، بلکہ بن مانگے دیتا ہے''۔ (۱۷)

آگے ''احد'' اور ''صمد'' کے بارے میں رقمطراز ہیں: ''احد(بے ہمہ) اور صمد (باہمہ) دو ثبوتی صفتیں ہیں اور بظاہر متقابل ہیں مگر خدائے پاک کی تمام صفتیں ایک ہی ذات کے مختلف مظاہر ہیں، ایک پر غور کرو تو دوسری سب اس میں شامل ہو جاتی ہیں، مختلف صفات سے اس کو مرکب سمجھنا غلطی ہے، پس جو کچھ تقابل ہے وہ منظر ظاہر ہے''۔(۱۸)

سیّد صاحب اور مولانا فراہی کے مذکورہ اقتباسات کو دیکھا جائے تو دونوں شخصیتوں کے خیال میں حد درجہ مماثلت اور ہم آہنگی ہے۔ دونوں کے یہاں احد اور صمد کے باب میں جو وضاحت وتفسیر ملتی ہے، اس کی بنیادی اور مرکزی باتیں ایک ہیں۔ یہی خیال مولانا علی میاں ندوی صاحب کا بھی ہے کہ سیّد صاحب کی تحقیق وتنقید میں افکار فراہی کا عکس نظر آتا ہے۔(۱۹)

سیّد صاحب کی خواہش تھی کہ مولانا حمید الدین فراہی کے قرآنی افکار و نظریات علمی دنیا کی نظروں کے سامنے آ جائیں، اس کے لیے انہوں نے خود ایک طرف کوشش کی کہ مولانا کی کتب شائع ہو کر منظر عام پر آ جائیں اور دوسروں کو بھی اس کی طرف رغبت دلائی کہ وہ مولانا کی کتب اور مقالات کو منظر عام پر لے آئیں اس کی طرف مولانا مجیب اللہ ندوی صاحب نے ان لفظوں میں اشارہ کیا ہے: '' ان کے وہ بیسیوں مضامین ہیں جو انہوں نے قرآن و سنت کے مختلف موقعوں پر معارف میں لکھے ہیں، ان مضامین کے علاوہ انہوں نے اس مقصد کی خاطر مولانا حمید الدین فراہی کی تفسیر کے مختلف حصوں کو اپنے خاص اہتمام سے چھپوایا، جن کی وجہ سے قرآن فہمی کی ایک نئی راہ کھلی''۔(۲۰)

سیّد صاحب مولانا فراہی کے مسودوں کے سلسلہ میں مولوی مسعود علی ندوی کو ایک خط میں لکھتے ہیں: '' مولوی امین صاحب سے (مدرسہ سرائے میر) مولانا حمید الدین صاحب کے بعض مسودوں کی نقل بغرض اشاعت مانگتے''۔(۲۱)

مذکورہ خط سے یہ بات اچھی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ سیّد صاحب کو ہر آن یہ فکر دامن گیر رہی کہ علمی دنیا کو مولانا فراہی کے گرانقدر کاموں سے روشناس کرایا جائے، اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب مولانا کی کتابیں طباعت کے مرحلے سے گزریں۔(۲۲)

۱۹۳۰ء میں سیّد صاحب کی کوششوں سے مولانا فراہی کی کتاب ''امعان فی اقسام القرآن'' قاہرہ سے شائع ہوئی۔ سیّد صاحب کی خواہش تھی کہ مولانا کے افکار و نظریات باہر کی علمی دنیا تک بھی پہنچیں۔ اسی مصری نسخہ کو ہندوستان کے علمی حلقوں تک پہنچانے کے لیے مولانا مسعود عالم ندوی کو ایک خط میں لکھتے ہیں: ''ایک بات خیال میں آئی ہے، آپ اس سال اگر کوئی رسالہ شائع نہ کریں بلکہ ''امعان فی اقسام القرآن'' ہمارے ہاں سے ڈیڑھ سو خرید کر خریداروں کو بھیج دیجئے آپ کو فی نسخہ ۸ کے حساب سے دیا جائے گا۔ یعنی پچھتر روپے میں ڈیڑھ سو نسخے مل جائیں گے۔ جو آپ کے خریداروں کے لیے کافی ہیں۔ اگر کوئی دوسری کتاب اس وقت چھپوائیں گے تو سو سوا سو لگ جائیں گے۔ امعان کی لوح کے آخری صفحہ پر ایک چٹ چھپوا کر لگوا دیجئے گا کہ یہ ''الضیاء'' کے دو ماہ کے تبادلہ میں شائع کیا جاتا ہے۔ امعان ابھی ہندوستان میں شائع نہیں ہوئی ہے۔(۲۳) اپنی رائے سے جلد مطلع کیجئے''۔(۲۴)

ایک دوسرے خط میں سیّد صاحب مولانا مسعود عالم ندوی کو لکھتے ہیں: '' مولانا حمید الدین صاحب کی تفسیر فیل کا مسودہ میرے پاس ہے، جس کا حجم پچاس صفحوں کا ہے۔ اگر مناسب ہو تو اس کو شائع کیا جائے''۔(۲۵)

سیّد صاحب کی یہ کوشش رہی کہ مجلہ الضیاء کے ذریعہ قارئین تک مولانا فراہی کی چیزیں پہنچائی جائیں، جس کے لیے ایڈیٹر مجلہ جناب مولانا مسعود عالم ندوی کو بار بار تاکید کرتے رہے۔ کیونکہ وہ مولانا کی کتب کو تبرک کا درجہ دیتے تھے۔ سیّد صاحب ایک خط میں مولانا مسعود عالم ندوی کے سامنے مولانا فراہی کی قرآنی تحقیقات کو یہ درجہ دیتے ہوئے پیش کرتے ہیں: '' مولانا حمید الدین صاحب'' کا کوئی تبرک مولوی امین صاحب سے مانگو اور تقاضہ کرو''۔(۲۶)

مولانا فراہی کے قرآنی علم و فضل کو سیّد صاحب نے اپنے استاذ علامہ شبلی نعمانی کے حوالہ سے ذکر کیا ہے، کہ جب مولانا فراہی نے اپنے تفسیری اجزاء کو علامہ کی خدمت میں ارسال کیا تو انہوں نے انہیں پسند نہیں کیا کہ قرآن کریم ایک منظم اور مرتب کتاب ہے، لیکن متعدد اجزاء کا مطالعہ کیا تو اپنے شاگرد کی اس سعی کو قدر کی نظروں سے دیکھا اور

حوصلہ افزائی کی اور بعد میں وہ مولانا فراہی کی قرآنی بصیرت کے اس درجہ قائل ہوگئے کہ مختلف قرآنی مشکلات میں ان سے مشورہ لینے لگے۔(۲۷)

مولانا کی عربی دانی

سید صاحب نے مولانا فراہی کے مختلف پہلوؤں کو موضوع بحث بنایا ہے۔ انہوں نے مولانا فراہی کی عربی دانی کا بھی ذکر کیا ہے اور مولانا کو عربی کا فاضل یگانہ، اور عربی کا سوق عکاظ قرار دیا ہے۔ دو ایک چیزوں کے علاوہ مولانا کی تمام علمی کاوشیں بزبان عربی ہیں۔ مولانا مودودی کا یہ قول مولانا فراہی کے بارے میں یکسر طور پر درست ہے کہ: "یہ بات پورے اطمینان سے کہی جا سکتی ہے کہ شاید ہی عربی کا کوئی اچھا شعر جو ان کے پیش نظر نہ ہو"۔(۲۸) سید صاحب نے مولانا کے عربی اساتذہ میں علامہ شبلی، مولانا عبدالحیٔ فرنگی محلی اور مولانا فیض الحسن سہارنپوری کے اسماء گرامی شامل کیے ہیں۔ بیس سال کی عمر میں عربی کی تعلیم سے فارغ ہوئے اور اس میں وہ اعلیٰ کمال حاصل کیا کہ جس پر ہندوستانی اپنے اساتذہ سے بھی سبقت لے گئے۔ اس سلسلے میں ان کا عربی دیوان شاہد ہے۔(۲۹)

سرسید نے مولانا فراہی کے علی گڑھ میں داخلہ کے وقت مسٹر بک(۳۰) کو جو کچھ لکھا تھا، اسے بھی سید صاحب نے مولانا کی عربی دانی کے سلسلے میں نقل کیا ہے۔ "اس زمانے میں کالج کے ہر طالب علم کو عربی و فارسی بھی لازماً پڑھنی پڑتی تھی مگر سرسید نے ان کے متعلق مسٹر بک کو لکھ کر بھیجا کہ حمید الدین عربی و فارسی کے ایسے ہی فاضل ہیں جیسے آپ کے کالج کے استاد اور پروفیسر ہیں۔ اس لیے ان کو مشرقی علوم کے گھنٹوں سے مستثنیٰ کر دیا جائے۔ چنانچہ وہ مستثنیٰ کیے گئے"۔(۳۱)

سید صاحب نے اپنے مضمون میں یہ بھی ذکر کیا ہے کہ مسٹر ارنلڈ(۳۲) کے ذہن میں عربی گرامر کی ایک کتاب کو انگریزی میں منتقل کرنے کا خیال آیا تو اس کے لیے ان کے ذہن میں مولانا فراہی ہی کا نام آیا(۳۳) کیونکہ مولانا کو عربی اور انگریزی پر یکساں طور پر قدرت حاصل تھی۔

مولانا فراہی کی عربی علوم و فنون و زبان و ادب پر دسترس کا اس قدر چرچا تھا کہ ۱۹۰۴ء میں جب لارڈ کرزن نے سواحل عرب اور خلیج فارس کا دورہ کیا تو عرب شیوخ اور

امراء کے سامنے اپنی بات کو پیش کرنے کے لیے مولانا فراہی کو بطور ترجمان اپنے ساتھ لے گیا۔ چنانچہ لارڈ کرزن کی جانب سے جو تقریر عرب سرداروں کے سامنے پیش کی گئی وہ مولانا ہی کی ترتیب دی ہوئی تھی۔(۳۴) یہ فریضہ بھی مولانا کے سپرد اس لیے کیا گیا کہ آپ انگریزی اور عربی دونوں زبانوں سے بخوبی واقف تھے۔

مولانا حمید الدین فراہی ترجمانی کا یہ فریضہ انجام دینا نہیں چاہتے تھے، لیکن علامہ شبلی نعمانی کے اصرار اور دباؤ سے مجبور ہوکر تیار ہوگئے۔ لیکن اس امر کو انہوں نے کبھی اپنے لیے باعث فخر تصور نہیں کیا۔ بلکہ زندگی بھر اس پر اظہار ندامت کرتے رہے اور اسے اپنی ایک سیاسی غلطی تصور کیا۔(۳۵) لیکن ادھر ایک صاحب کی تحقیق یہ ہے کہ مولانا کو اپنی اس ترجمانی پر کوئی ندامت نہیں ہوئی اور نہ ہی کبھی اس پر اظہار افسوس کیا۔(۳۶) لیکن یہ صاحب نہ تو مولانا فراہیؒ کے شاگرد رہے اور نہ معاصرین میں سے تھے۔ اس لیے ان کی یہ تردید قابل اعتبار نہیں۔

سیّد صاحب نے اپنے مضمون سے جرمن فاضل جوزف ہارویز کا علی گڑھ کالج میں تقرر کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ ۱۹۰۶ء میں انہیں عربی تعلیم کے لیے بلایا گیا(۳۷) اور اسی زمانے میں مددگار پروفیسر کی حیثیت سے مولانا فراہی کا تقرر ہوا۔ ہارویز نے مولانا سے اپنی عربی کی تکمیل شروع کر دی اور مولانا نے ہارویز سے عبرانی سیکھنا شروع کی۔(۳۸)

مذکورہ جملہ واقعات سے یہی مترشح ہوتا ہے کہ مولانا کو عربی لکھنے اور بولنے نیز اس میں اپنی آراء کو پیش کرنے کا پورا ملکہ حاصل تھا۔

فارسی دانی

عربی زبان و ادب کی طرح مولانا کو فارسی زبان و ادب کا بھی اچھا ذوق تھا، سیّد صاحب فرماتے ہیں کہ ”مولانا کو ادبیات سے فطری لگاؤ تھا۔ چنانچہ فارسی زبان اور فارسی ادب کا ذوق بچپن سے ان میں نمایاں تھا(۳۹) اور وہ اس وقت عربی اور فارسی کے مشہور استاذ مولانا فاروق چریا کوٹی (متوفی ۲۸/اکتوبر ۱۹۰۹)(۴۰) کے پاس آتے جاتے رہتے تھے“۔

سیّد صاحب نے مولانا کی فارسی زبان کے بارے میں مزید فرمایا ہے کہ مولانا نے سولہ سال کی عمر میں فارسی کے سب سے مشکل گو شاعر خاقانی شروانی کے تتبع میں ایک قصیدہ لکھا جو سلطان عبدالحمید خاں کی مدح میں تھا۔ ۲۸ شعروں کے اس قصیدہ کی زبان، لطف و رعنائی اور شکوہ دیکھ کر سب کو حیرت تھی۔ علامہ شبلی نے اس قصیدہ کو مولانا فاروق چریا کوٹی کے سامنے پیش کر کے پوچھا۔کہ یہ کس کا ہو سکتا ہے تو انہوں نے کہا کہ قدیم شعراء میں سے کسی کا ہو سکتا ہے۔ علامہ نے فرمایا کہ حمید کا ہے تو اس پر انہیں حد درجہ حیرت ہوئی۔(۴۱)

اسی طرح سرسیّد نے علامہ شبلی سے عربی میں سیرت نبویؐ پر ایک رسالہ لکھوایا تھا جو ''بدرالاسلام'' کے نام سے شائع ہوا۔ بعد میں مولانا نے اسے عربی میں منتقل کیا۔ یہ رسالہ علی گڑھ کالج کے دینیات کے کورس میں شامل تھا۔

''طبقات ابن سعد'' کا رموز نبوی سے متعلق ایک ٹکڑا سرسیّد کے ہاتھ آیا جو ابھی تک شائع نہیں ہوا تھا۔ انہوں نے اسے مولانا فراہی کو عربی میں ترجمہ کرنے کے لیے دیا۔ چنانچہ ترجمہ کے بعد سرسیّد نے اسے شائع کروایا۔ سیّد صاحب اس ترجمہ کی زبان اور اسلوب کے متعلق فرماتے ہیں کہ اس کی زبان ایسی ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ عہد سامانی کا کوئی نثر نویس فارسی لکھ رہا ہے۔(۴۲) مولانا فراہی کی فارسی زبان کے اس اعلیٰ معیار کو مدنظر رکھتے ہوئے ہی علامہ شبلی نعمانی نے حبیب الرحمان خان شیروانی(۴۳) کی خدمت میں مولانا فراہی کا فارسی دیوان بھیجتے ہوئے یہ لکھا تھا کہ ''فارسی زبان اس کا نام ہے''۔(۴۴) اسی طرح علامہ شبلی کو پروفیسر آرنلڈ کو فارسی میں الوداعیہ پیش کرنا پڑا تو انہوں نے اس تقریر کے لیے مولانا فراہی کو اس طرح لکھا: '' مسٹر آرنلڈ قطع تعلق کر کے ولایت جا رہے ہیں۔ علی گڑھ میں ان کو ایڈریس دیئے جائیں گے۔ ایک فارسی میں بھی ہوگا اس کی مجھ سے فرمائش ہے لیکن میں فارسی اچھی نہیں لکھتا، اس لیے تم فوراً ایک تقریر لکھ کر پروفیسر ابوالحسن علی گڑھ کالج کے پاس بھیج دو''۔(۴۵)

تصانیف فراہی

سیّد صاحب نے مولانا فراہی کی کچھ کتابوں پر تبصرے کیے ہیں اور کچھ جگہوں پر

مولانا فراہی کی مختلف کتابوں پر اظہار خیال بھی۔ سیّد صاحب کے اس تبصرہ اور اظہار خیال سے مولانا کی مختلف عظمت و رفعت منظرِ عام پر آجاتی ہے۔ سیّد صاحب نے پہلی بار مولانا فراہی کی ۳۳ تصانیف کا ذکر ''امعان فی اقسام القرآن'' کے مصری ایڈیشن میں کیا۔ جن میں غیر مطبوعہ کتابوں کی تعداد ۲۶ تھی۔ ان کتابوں کا ذکرکرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ جو شخص بھی ان کتابوں کے عناوین پر ایک نظر ڈالے گا وہ ضرور حیرت میں پڑ جائے گا اور مصنف کی عالمانہ شان، فکر و نظر کی درستگی، علم و فضل کی کثرت، سلامت ذوق، ذہن کی بیداری، قرآن کریم میں غور و فکر اور اس کے اصول و معانی کی بازیافت نیز قرآن کے مشکل و آسان مفاہیم تک رسائی کا ضرور اعتراف کرے گا۔(۴۶)

''امعان فی اقسام القرآن'' مولانا فراہی کی ایک معرکتہ الآراء تالیف ہے، اس موضوع پر شروع ہی سے اظہار خیال کیا جاتا رہا ہے، اور بے شمار کتب اس موضوع پر منظرِ عام پر آئیں، ان کتابوں کے تناظر میں مولانا کی کتاب کا مطالعہ کیا جائے تو مولانا کے یہاں ضرور ایک انفرادیت نظر آتی ہے۔ اسی انفرادیت اور قیمتی آراء کے پیش نظر سیّد صاحب نے اپنی کوششوں سے اسے مصر سے شائع کرایا اور تعارف کے طور پر اس پر پیش لفظ بھی رقم فرمایا۔ اس کی اہمیت کی طرف ان لفظوں میں اشارہ کیا:

> '' علی گڑھ کے قیام ہی کے زمانہ میں انہوں نے اقسام القرآن لکھی، یعنی اس مشکل کا حل فرمایا کہ خدا نے قرآن مجید میں قسمیں کیوں کھائی ہیں، اس سوال کے جواب میں سب سے پہلے امام رازی نے تفسیر کبیر میں جستہ جستہ فقرے لکھے تھے، پھر ابن القیم نے '' التبیان فی اقسام القرآن'' لکھی، مگر مولانا حمید الدین صاحب کی تحقیقات نے اپنی ایک الگ شاہراہ نکالی، اور حقیقت یہ ہے کہ اس بارے میں انہوں نے ایسی داد تحقیق دی کہ تیرہ سو برس میں اسلام میں کسی نے نہیں دی، مولانا شبلی مرحوم نے ان کے اس رسالہ کا خلاصہ نہایت مسرت اور خوشی کے ساتھ الندوہ میں اپریل ۱۹۰۶ء میں شائع کیا، اور عربی رسالہ اقسام القرآن کے نام سے الگ شائع ہوا، اس کے بعد اس رسالہ کو مزید

تحقیقات سے موئد کر کے "امعان فی اقسام القرآن" کے نام سے علی گڑھ میں چھپوایا، اس وقت سے لے کر آج تک مختلف مدعیان تحقیق نے اقسام القرآن پر جو کچھ کہا وہ تمام تر مولانا کے خوان علم کی زلہ ربانی ہے"۔ (۴۷)

سیّد صاحب نے مولانا فراہی کے تفسیری اجزاء کو بڑی قدر کی نظر سے دیکھا ہے اور فرماتے ہیں کہ " سب سے اہم کام وہ بیس پچیس برس سے یہ کر رہے ہیں کہ عربی میں نئے طرز پر قرآن مجید کی تفسیر لکھ رہے ہیں"۔ (۴۸)

تفسیر سورہ ابی لہب اور سورہ قیامہ کے باب میں فرماتے ہیں " اس کے بعد اگست ۱۹۰۶ء میں اقسام القرآن کے علاوہ سورہ ابی لہب اور سورہ قیامہ کی تفسیریں چھپیں اور اہل علم نے ان کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا، علامہ سیّد رشید رضا صاحب المنار مصر جو تفسیر لکھ رہے تھے، (۴۹) انہوں نے اس پر مداحانہ اور معترفانہ تقریظ لکھی اور تحسین کی"۔ (۵۰)

حیدر آباد کے قیام (۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۹ء تک) کے دوران مولانا فراہی نے "حزرنامہ" یعنی مواعظ سلیمانی کی تکمیل کی اور چھپوائی۔ (۵۱) "خزرنامہ" پر سیّد صاحب نے معارف میں تبصرہ بھی کیا۔ اس منظوم نامہ کی خاص صفت یہ ہے کہ خالص فارسی زبان میں ہے یعنی اس میں عربی الفاظ کی آمیزش نہیں ہے۔ (۵۲) سید صاحب اس کے متعلق اس طرح رطب اللسان ہیں " مولانا ہندوستان نژاد ہیں لیکن حسن مذاق اور فارسی ذوق نے شیرازی بنا دیا ہے۔ ان کی فارسی زبان پر خود مولانا مرحوم کو رشک تھا۔ ان کا مطبوع کلام "دیوان حمید" اپنے ایک دوست کو بھیجتے ہیں تو لکھتے ہیں" فارسی زبان اس کا نام ہے"۔

فارسی کا عربی سے الگ کرنا گوشت کو ناخن سے الگ کرنا ہے، اس قید و احتراز کے ساتھ اور لوگوں نے بھی فارسی لکھی ہے ، یا تو وہ نباہ نہ سکے یا زبان چیستان ہو کر رہ گئی۔ خسرونامہ کا کمال یہ ہے کہ وہ سرتاپا خالص فارسی زبان میں ہے۔ ایک لفظ عربی کا اس میں شامل نہیں۔ پھر زبان کی شستگی، روانی، آسانی، اور زودچشمی میں سرِمو فرق نہیں آیا۔ (۵۳)

مسعود عالم ندوی نے اپنے کسی خط میں سید صاحب کو لکھا کہ مولانا فراہی کی کتاب ''جمہرۃ البلاغۃ''(۵۴) کو پڑھنے کے بعد یہ اندازہ ہوا کہ اس کی زبان پر عجمیت کا اثر ہے۔ندوی صاحب کو سیّد صاحب نے اس کا یوں جواب دیا: '' مولانا فراہی کے یہاں عجمیت شاید ہی کہیں ہو، غایت احتیاط سے آپ کو وہم بھی ہو سکتا ہے، کیونکہ آپ بھی مصریت کے شکار ہیں، پھر عجمیت سے مشکوک کیوں۔ بہرحال آپ کتاب کا نام اور سطر و مقام شک لکھ بھیجیں''۔(۵۵)

سیّد صاحب کا مذکورہ خط پانے کے بعد مسعود عالم ندوی صاحب نے مشکوک مقامات پر نشانات لگا کر کتاب کو سیّد صاحب کی خدمت میں ارسال کیا۔ تو اس کا جواب یوں دیا: ''ہاں بھائی ''جمہرۃ'' کی عبارتیں دیکھیں، آپ کے تنبیہات صحیح ہیں۔ یہ مولانا فراہی کی ابتدائی تصنیف ۱۹۰۴ء میں غالباً لکھی گئی تھی۔ پھر قلم منجھتا گیا۔ پھر بھی اس کی عربیت کافی بلند ہے۔ یہی چند الفاظ اور محاورے ان کے قلم پر چڑھ گئے ہیں''۔(۵۶)

مولانا فراہی کی ایک مشہور کتاب ''اسباق النحو'' ہے۔ اس کتاب کے عنوان پر مولانا علی حیدر نظم طباطبائی نے یہ اعتراض کیا کہ ''اسباق'' کا لفظ عربی نہیں بلکہ عجمی یا ہندی جمع ہے، اور ''سبق'' اس معنی میں عربی ہی نہیں، صحیح ''درس'' و ''دروس'' ہے۔ اسی طرح مولانا طباطبائی نے کتاب کے ایک جملہ ''قرس نفیس'' پر اعتراض کرتے ہوئے بتایا کہ یہ کوئی عربی محاورہ نہیں، خالص ہندی ہے۔(۵۷)

اس اعتراض کو مولانا دریا بادی نے سیّد صاحب کی خدمت میں پیش کیا۔ سیّد صاحب اس کے جواب میں لکھتے ہیں ''اسباق کا لفظ آپ لغت میں ڈھونڈتے ہیں۔ عربوں میں تعلیم کہاں تھی جو اسباق کا مفہوم اور اس کے لیے لفظ ان کے یہاں ہوتا۔ یہ عجمی استعمال ہے اور کتابوں میں بھی آ جاتا ہے۔ چنانچہ ''شرح وقایہ'' کے مقدمہ میں بھی ہے، ''قرس نفیس'' والا اعتراض بھی مہمل ہے''۔(۵۸)

سیّد صاحب نے مولانا فراہی کی اور بہت سی کتابوں پر تبصرہ کرتے ان کی اہمیت و افادیت کو علمی دنیا کے سامنے پیش کیا۔ سید صاحب کے تبصروں سے یہ واضح ہے کہ مولانا فراہی کو قرآنیات پر بڑا عبور حاصل تھا۔(۵۹)

سیرۃ النبیؐ

سیرۃ النبی علامہ شبلی نعمانی کی آخری تصنیف ہے، یہ کتاب زبان و بیان، تحقیق و تنقید اور تحلیل و تجزیہ کے لحاظ سے اپنی مثال آپ ہے، اس کتاب کی تالیف کے دوران بہت سے ایسے مباحث آئے کہ علامہ نے اپنے شاگرد اور عزیز مولانا فراہی سے استفادہ کیا۔ جس کا ذکر مکاتیب شبلی میں متعدد جگہوں پر ملتا ہے۔(۶۰) نیز اس کی طرف سیّد صاحب نے بھی اشارہ کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

> "سیرت کا ان مباحث میں جن کا تعلق صحف بنی اسرائیل اور قرآن پاک سے ہے، وہ اپنے بھائی مولوی حمید الدین صاحب سے جنہوں نے اس قسم کے مسائل پر بہ تحقیق غور کیا تھا۔ اکثر مشورے کرتے رہتے تھے۔ جن کا حوالہ مکاتیب شبلی میں جا بجا ہے"۔(۶۱)

اسی کی طرف پروفیسر محمد راشد ندوی نے بھی اشارہ کیا کہ "سیرت کا جو منظم خاکہ مرتب ہو چکا تھا، اس کے مطابق کام شروع کیا اس میں کبھی سیّد سلیمان نظر آتے ہیں تو کبھی مولانا عبدالسلام۔ کبھی حمید الدین فراہی تو کبھی عبدالماجد دریا بادی"۔(۶۲)

سیرۃ النبیؐ کا ۱۹۰۶ء میں علامہ شبلی نے جو خاکہ بنایا تھا، افسوس کہ وہ اسے پایہ تکمیل کو نہ پہنچا سکے۔ چنانچہ اس کام کو ادھورا چھوڑ کر ۱۵ نومبر ۱۹۱۴ء اپنے رب کے بلاوے پر لبیک کہا۔ علامہ کو اپنی صحت کے پیش نظر یہ اندازہ تھا کہ اب یہ کام میرے بس کا نہیں۔ اسی کے پیش نظر انہوں نے جان جاں آفریں کے سپرد کرنے سے قبل اپنے تین لائق تلامذہ کو خطوط لکھے تاکہ ان کے سامنے اس ادھورے کام کا پورا نقشہ پیش کر دیا جائے اور اس نامکمل کام کو انجام دے سکیں۔ اس سلسلے میں علامہ نے ۱۵ نومبر ۱۹۱۴ء کو مولانا حمید الدین فراہی، مولانا ابوالکلام آزاد اور سیّد صاحب کو تار دیئے۔ لیکن یہ تار مولانا آزاد کے علاوہ کسی کو نہ مل سکا۔(۶۳) اس تار کا مضمون یہ تھا: "اگر آپ اس اثناء میں مل جاتے تو سیرت نبویؐ کی اسکیم کا کچھ انتظام ہو جاتا، ورنہ سب کارروائی بے کار ہو جائے گی۔ سیّد سلیمان اگر موجود ہوتے تو ان کو پورا پلین سمجھا دیتا"۔(۶۴)

آزاد صاحب تو نہ پہنچ سکے لیکن ۱۵ نومبر ۱۹۱۴ء کی شام کو سیّد صاحب خدمت اقدس میں حاضر ہوئے تو معاہدہ کے طور پر ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر فرماتے ہیں: ''سیرت میری تمام عمر کی کمائی ہے۔ سب کام چھوڑ کے سیرت تیار کر دو'' سیّد صاحب نے اس کے جواب میں کہا '' ضرور! ضرور!''۔

۱۶ نومبر کی شام کو مولانا حمید الدین فراہی صاحب بھی حیدر آباد سے تشریف لائے، جن کا علامہ شدت سے انتظار کر رہے تھے۔ ۱۷ کی صبح کو سیّد صاحب اور مولانا فراہی کو علامہ نے یاد کیا اور زبان مبارک سے یہ کلمات ادا ہو رہے تھے ''سیرت، سیرت، سیرت! کہا اور پھر انگلی سے لکھنے کا اشارہ کر کے کہا، سب کام چھوڑ کے''۔ (۶۵)

چنانچہ استاذ گرامی کے اس حکم کو سیّد سلیمان ندوی صاحب نے پایہ تکمیل تک پہنچانے کا قصد کیا اور خدا کا شکر ہے کہ انہوں نے بہتر طریقے سے اسے انجام دیا اور مولانا حمید الدین فراہی سے سیرت کی تکمیل میں مختلف جگہوں پر مدد لی۔ شیخ اکرام نے یہ بات بجا فرمائی ہے کہ ''شبلی سے سیرت پوری نہ ہوئی اور اگرچہ ان کی وفات کے بعد سیّد سلیمان ندوی اور ان کے رفقائے کار نے کتاب کو مکمل کر دیا''۔ (۶۶)

یہاں پر شیخ اکرام نے جو ''رفقائے کار'' کا لفظ استعمال کیا ہے۔ ان میں مولانا حمید الدین فراہی کا نام نامی سرفہرست ہے۔ سیّد صباح الدین صاحب نے سیرت سے متعلق مولانا فراہی کے تعاون کے باب میں لکھا ہے کہ ''سیرت کی تیسری جلد جو معجزات پر ہے، ان ہی کے فلسفہ کی تقلید ہے''۔ (۶۷)

سیّد صاحب کے اسی استعارے کا ذکر خود انہی کی زبان سے سنیے ''سب سے آخری جلوہ قرآن پاک کا نظر آیا، مولانا شبلی مرحوم نے اس کا آغاز کیا اور مولانا حمید الدین مرحوم کی دلچسپ و مفید صحبتوں میں یہ چسکا اور آگے بڑھتا چلا گیا اور اسی کا یہ اثر ہوا کہ سیرت نبویؐ کی ہر بحث میں قرآن پاک میری عمارت کی بنیاد ہے اور حدیث نبویؐ اس کے نقش و نگار ہیں''۔ (۶۸)

سیرت النبیؐ کی تیسری جلد کے مقدمہ میں بھی سیّد صاحب نے اس کا اعتراف کیا ہے کہ مشکلات میں ہم مولانا فراہی کی طرف رجوع کرتے، فرماتے ہیں '' ان اوراق کی

تالیف میں ہم اپنے ان محسنوں کے شکرگزار ہیں جنہوں نے اس کی تکمیل میں ہمارا ہاتھ بٹایا۔ مشکلات و غوامض میں مخدومنا مولانا حمید الدین صاحب کے مشوروں نے فائدہ پہنچایا''۔(۶۹)

مولانا فراہی اور حیدر آباد

مولانا حمید الدین فراہی نے اپنے حیدر آباد کے قیام کے دوران کئی علمی خدمات انجام دیں۔ وہاں پر ایک قدیم عربی مدرسہ دارالعلوم کے نام سے تھا، جس کا مدراس یونیورسٹی کے شعبہ مشرقیات سے الحاق تھا۔ ۱۹۰۸ء میں یونیورسٹی نے اس الحاق کو توڑ دیا۔ تو ذمہ داران مدرسہ کو اس کی وجہ سے فکر لاحق ہوئی اور انہوں نے اہل علم و فن کی ایک مجلس تشکیل دی جس کے ایک ممبر علامہ شبلی نعمانی بھی تھے، اس مجلس نے عربی یونیورسٹی کا ایک خاکہ تیار کیا اور اس اسکیم کے مطابق دارالعلوم کو چلانے کے لیے مولانا حمید الدین فراہی کا انتخاب ہوا۔ چنانچہ ۱۹۱۴ء میں الہ آباد سے حیدرآباد چلے گئے اور اپنی ذاتی کوششوں سے دارالعلوم کو ترقی کی راہوں پر گامزن کر دیا۔ درس و تدریس کے علاوہ مدرسہ کی انتظامی نگرانی بھی آپ کے سپرد تھی۔

حیدر آباد ہی میں نواب عماد الملک نے قرآن پاک کا جو انگریزی کام شروع کیا تھا، وہ نصف کے قریب انجام پا چکا تھا جس میں جا بجا نقائص تھے، چنانچہ نواب صاحب نے مولانا کے قیام کو غنیمت جانا اور اس ترجمہ کے سلسلہ میں مولانا سے استفادہ کیا۔ سیّد صاحب کہتے ہیں کہ روزانہ صبح مولانا نواب صاحب کی خدمت میں جاتے اور ترجمہ پر نظرثانی کرتے، اس طرح کئی پاروں کے ترجمہ میں اصلاح و ترمیم کی گئی۔ بعد میں سیّد صاحب نے نواب صاحب کے خلف الرشید نواب مہدی یار جنگ سے اس ترجمہ کے متعلق پوچھا تو مہدی صاحب نے تلاش بسیار کے بعد اپنی لاعلمی ظاہر کی۔(۷۰)

حیدر آباد کے قیام ہی کے دوران سیّد صاحب فرماتے ہیں کہ مولانا نے عصری علوم و فنون کی اردو زبان میں تعلیم کی تجویز پیش کی اور اس کا خاکہ تیار کیا، ان کا خیال تھا کہ دینیات کی تعلیم عربی میں ہو اور باقی تمام علوم یہاں تک کہ اصول فقہ بھی اردو میں پڑھائے جائیں۔ لیکن راس مسعود صاحب اور نواب سرحیدر نواز جنگ حیدری صاحب نے ان

کے اس تخیل کو علوم کی تعلیم کی زبان اردو ہو قبول کیا، مگر یہ کہ تمام لڑکوں کو دراصل دینیات کی عربی تعلیم دی جائے قبول نہیں کیا اور یہی درحقیقت حیدر آباد سے ان کی دل برداشتگی کا سبب ہوا۔

۱۹۱۷ء میں جامعہ عثمانیہ کی طرف جو نصابی کتب کے تراجم اور اصطلاحات کی وضع کرنے کا جو کام شروع ہوا تھا۔ آپ اس مجلس کے رکن تھے اور سیّد صاحب کے بقول وضع اصطلاحات میں مولانا فراہی قیمتی اور مفید مشورے دیا کرتے تھے اور جامعہ کے نقش و تخیل کی رنگ آمیزی میں بڑا نمایاں رول ادا کیا۔ ۱۹۱۹ء میں باقاعدہ جامعہ کا افتتاح ہوا اور اس کے پہلے شیخ الجامعہ مولانا حبیب الرحمان خاں شیروانی ہوئے۔ انہوں نے اپنے ایک خط میں یہ تحریر فرمایا ہے(۷۱) کہ جامعہ عثمانیہ کے مؤسسین میں مولانا فراہی کا اسم گرامی بھی شامل ہے۔(۷۲)

حیدر آباد میں ان تمام ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ مولانا نے اپنا تصنیفی اور تحقیقی کام بھی جاری رکھا۔ خسرونامہ کی تکمیل کی اور یہیں سے چھپوایا۔ اسباق النحو کے دونوں حصے بھی یہیں ترتیب دیئے جو انجمن ترقی اردو کی جانب سے شائع ہوئے، نیز اپنے استاد مولانا فیض الحسن سہارنپوری کے عربی دیوان کی تصحیح کر کے چھپوایا۔ ''الرای الصحیح'' تصنیف کی اور تفسیر کے بعض مقدمات لکھے۔(۷۳)

حیدر آباد کے قیام ہی کے دوران درس قرآن کا ایک حلقہ قائم کیا تھا۔ سیّد صاحب اس کے متعلق وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ بعد نماز مغرب درس قرآن کی یہ نشست منعقد ہوتی۔ مولانا تقریر کرتے اور سامعین اپنے شکوک پیش کرتے اور مولانا اس کے جوابات دیتے۔ اس مجلس کے خصوصی شرکاء میں مولانا مناظر احسن گیلانی کا نام بھی آتا ہے جو اس وقت جامعہ عثمانیہ میں پروفیسر تھے۔ کبھی کبھی مولوی وحید الدین سلیم بھی اس حلقہ میں شامل ہو جاتے تھے۔ سیّد صاحب مزید لکھتے ہیں کہ مجھے بھی ایک دو دفعہ اس درس قرآن میں بیٹھنے کا اتفاق ہوا ہے۔

۱۹۱۹ء تک مولانا کا قیام حیدر آباد میں رہا۔ آپ نے اس وقت حیدر آباد کو خیر باد کہا جب کہ جامعہ عثمانیہ کا ہیولی صورت قبول کر رہا تھا۔ آپ کی اس واپسی سے کچھ

لوگوں کو شدید قلق ہوا۔ (۷۴)

دارالمصنفین

علامہ شبلی کو مولانا فراہی کی استعداد و لیاقت پر پورا پورا بھروسہ تھا، جس طرح انھوں نے سیرت کی تکمیل کے باب میں انہیں لائق تصور کیا، اسی طرح انھوں نے دارالمصنفین کے علمی اور انتظامی امور میں انہیں با اہل تصور کیا۔ ایک خط میں علامہ شبلی نعمانی مولانا فراہی کو لکھتے ہیں: ''افسوس کہ سیرت پوری نہ ہوسکی اور کوئی نظر نہیں آتا کہ اس کام کو پورا کر سکے۔ وقف نامہ میں اسٹامپ کا جھگڑا تھا اس لیے کلکٹر کے یہاں درخواست دے دی وہ طے کر دیں تو تکمیل ہو جائے، تم کو متولیوں میں رکھا ہے اور اگر دارالمصنفین قائم ہوا تو تمہارے سوا کون چلائے گا''۔ (۷۵)

چنانچہ استاد محترم کی اس خواہش کو ملحوظ رکھتے ہوئے مولانا فراہی نے ۲۱ نومبر ۱۹۱۴ء واقعہ کے تیسرے دن ایک میٹنگ رکھی اور ''اخوان الصفا'' کے نام سے ایک مجلس کی تاسیس ہوئی اور مولانا فراہی کو اسی میٹنگ میں رئیس مجلس منتخب کیا گیا۔ (۷۶) اور اس کا علمی کاروان اپنی منزل کی تلاش میں رواں دواں ہوگیا۔ یہ کاررواں اپنے تمام امور میں مولانا فراہی سے رجوع کرتا۔ سید صاحب نے دارالمصنفین کے سلسلہ میں مولانا کی حیثیت کی تعیین ان الفاظ میں کی ہے:۔

'' ان کا وجود دارالمصنفین کے لیے سہارا تھا''۔ (۷۷)

سید صاحب جب پاکستان چلے گئے تو وہاں سے مجلس عاملہ کی صدارت کے بارے میں فرماتے ہیں کہ یہ عہدہ ماجد میاں کو دیا جا سکتا ہے، گو مولانا حمید الدین صاحب کے بعد یہ عہدہ غیر ضروری ہوگیا ہے۔ (۷۸)

سید صاحب کی ان باتوں سے یہ اندازہ لگانے میں کوئی دشواری نہیں کہ دارالمصنفین کی تعمیر و ترقی میں مولانا فراہی کا اہم رول رہا ہے۔

مدرسۃ الاصلاح

دارالمصنفین کے ساتھ ساتھ مولانا فراہی نے مدرسۃ الاصلاح کو اپنی خصوصی توجہ کا مرکز قرار دیا۔ دارالمصنفین کی طرح استاد محترم نے مدرسۃ الاصلاح کا مسئلہ بھی مولانا کے

سامنے پیش کیا۔ علامہ اپنے ایک خط میں مولانا کو لکھتے ہیں:۔

"کیا تم چند روز سرائے میر کے مدرسہ میں قیام کر سکتے ہو، میں بھی شاید آؤں اور اس کا نظم و نسق درست کر دیا جائے، اس کو گروکل کے طور پر خالص مدرسہ بنانا چاہیے، یعنی سادہ زندگی اور قناعت اور مذہبی خدمت مطمع زندگی ہو"۔(۷۹)

یہ بات علامہ نے اس لیے کہی کہ ان کے سامنے ایک "جامعہ اسلامیہ" کا تصور تھا۔ چنانچہ مولوی مسعود علی ندوی کو لکھتے ہیں "دارالمصنفین درجہ تکمیل، سرائے میر درجہ ابتدائی، پورا جامعہ اسلامیہ کا مصالحہ ہے، کام کرنے کی ضرورت ہے"۔(۸۰)

اسی کے پیش نظر مولانا فراہی نے مدرسۃ الاصلاح کی ترقی کے لیے اپنی تمام تر قوت کو صرف کر دیا۔ مدرسۃ الاصلاح کا اصل تعلیمی منہج یہ تھا کہ قرآن کریم کی محققانہ تعلیم اور بقیہ تمام علوم و فنون قرآن کریم کی روشنی میں پڑھائے جائیں اور اس مدرسہ کا ایک منصوبہ بھی تھا کہ قرآن کریم کو مضبوطی سے پکڑنے کے بعد ہی قوم انحطاط و تنزلی سے نکل سکتی ہے اور صراط مستقیم پر گامزن ہو سکتی ہے۔ اس کے بعد سیّد صاحب مزید فرماتے ہیں:

"اللہ تعالیٰ کی توفیق سے مدرسۃ الاصلاح نے یہ راز پا لیا ہے اور قرآن کو سرچشمہ ہدایت و ترقی تسلیم کر کے جملہ علوم کی تعلیم اس کی تعلیم کے ماتحت کر دی۔ وہ فقہ، حدیث، سیر، منطق و حکمت کی تعلیم دیتا ہے لیکن اس طور پر کہ جس علم کی طرف قدم بڑھے قرآن کی روشنی میں اور جو دروازہ کھلے قرآن ہی کے اندر سے کھلے"۔(۸۱)

مولانا یہاں آنے سے قبل حیدر آباد میں ایک اعلیٰ عہدہ پر فائز تھے، اسی کی طرف روشنی ڈالتے ہوئے سیّد صاحب لکھتے ہیں: "مولانا نے اس مدرسہ کو ترقی دے کر ملت کی کیا اصلاح کی؟ اور انہوں نے گراں بہا معاوضہ اعلیٰ اعزاز و دنیوی منصب اور شیر دل کی لذت بخش زندگی کو چھوڑ کر سادگی، قناعت اور گمنامی کے ساتھ اپنی عمر کا ایک جگ کیوں ایک دیہات میں بیٹھ کر عربی کے ایک مدرسہ کی خدمت گزاری میں بسر کیا"۔(۸۲)

آگے سیّد صاحب مزید لکھتے ہیں کہ مولانا نے اپنے دور نظامت میں بہت سی عمارتیں بنوائیں اور اپنا ذاتی کتب خانہ مدرسہ کو دے دیا۔ اس مدرسہ کی خاص صفت یہ ہے

کہ اس کے ہر شعبہ میں سادگی ہے، اساتذہ نہایت معمولی تنخواہ پر اپنا فریضہ خوش اسلوبی اور لگن سے انجام دے رہے ہیں۔ سیّد صاحب نے یہ بھی بتایا کہ مولانا فراہی قرآن کریم کے مختلف مباحث و مسائل میں اپنی آراء اساتذہ کے سامنے پیش کرتے اور اپنے طریقہ تعلیم سے انہیں باخبر کیا اور مدرسین اور اعلیٰ طلبہ کا ایک حلقہ بنا کر ان کے سامنے متعدد بار پورے قرآن کا درس دیا اور فلسفہ جدید کے بعض مباحث کا بھی ان کے سامنے ذکر کیا۔ طلبہ میں جن لوگوں نے مولانا کے درس سے پورا پورا فائدہ اٹھایا، ان میں مولانا امین احسن اصلاحی کا نام سرفہرست ہے۔ مولانا اپنے آخری ایام میں تصنیف و تالیف کو چھوڑ کر اپنا تمام تر وقت طلبہ کی تربیت اور ان کے غور و خوض پر صرف کرتے اور انہی کو اپنی زندگی کا ماحصل تصور کیا۔ (۸۳)

فتنہ تکفیر

ہندوستان میں فتنہ تکفیر ایک عام چیز ہے، اور اس فتنہ کا فروغ ایک ایسے حلقہ میں ہوا جس کے لوگ حاملین کتاب و سنت ہیں اور انہیں وارثین انبیاء کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے، اس فتنہ نے ان لوگوں کو بھی ہدف تنقید بنایا جنہوں نے اپنی پوری پوری زندگیاں قرآن و سنت کے احیاء میں صرف کر دیں۔ مذہب اسلام نے مختلف ذرائع سے دینی رشتہ کی حفاظت کی تاکید کی ہے چہ جائیکہ ایک مومن پر کفر کا فتوی صادر کیا جائے، اسلام میں تو یہاں تک آیا ہے کہ اگر کوئی غیر مومن شخص کسی وجہ سے خود کو مومن بتا رہا ہو تو اسے ہمیں کافر کہنے کا حق نہیں ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے:

ولاتقولوا لمن القی الیکم السلام لست مومناً (النساء۔۹۴)
جو شخص (اسلام کے لیے) تم کو سلام کرے اس کو نہ کہو کہ تو مومن نہیں ہے)

ایک مرتبہ کسی جنگ میں ایک شخص نے مسلمانوں کو السلام علیکم لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہا لیکن ایک مسلمان نے اسے یہ گمان کر کے قتل کر دیا کہ اس نے یہ بات اپنی جان بچانے کے لیے کہی ہے۔ آنحضورﷺ کو جب اس کی اطلاع ملی تو اس پر سخت برہم ہوئے اور آپؐ نے کہا کہ "ھل شققت قلبہ" کیا تو نے اس کا دل چیر کر دیکھا تھا۔ مختصر یہ

ہے کہ ہماری علماء برادری کو اس مسئلہ میں حد درجہ احتیاط سے کام لینے کی ضرورت ہے لیکن آج تک یہ سلسلہ جاری و ساری ہے۔ اسی سلسلہ کی ایک کڑی وہ فتویٰ ہے جس میں علامہ شبلی اور مولانا حمید الدین فراہی کودائرہ کفر میں پہنچا دیا گیا۔ یہ فتوی تھانہ بھون سے صادر ہوا، جس پر جناب مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا ظفر احمد صاحب، مولانا شبیر احمد عثانی، اور مولانا قاری محمد طیب صاحب کے دستخط ثبت ہیں اور اس کی تائید سہارنپور، گنگوہ اور دیوبند وغیرہ کے بعض مولوی صاحبان نے بھی کی ہے۔(۸۴) جن کے علم وفضل اور تقوی و خشیت میں کوئی شبہہ نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن علامہ شبلی اور مولانا کی تکفیر میں بقول مولانا مودودی کہ ان علماء کرام نے جس سہل انگاری سے کام لیا ہے اس کو یہ شبہہ ہوتا ہے کہ اب ایک مسلمان کی تکفیر ایک چیونٹی کے مار دینے سے بھی سہل انگار ہوگئی ہے۔(۸۵)

علامہ شبلی پر کفر کا فتویٰ ان کی کتاب ''الکلام'' کے چند فقروں کو سامنے رکھتے ہوئے عائد کیا گیا، حالانکہ یہ فقرے ملاحدہ کے وہ اعتراضات ہیں جنہیں علامہ نے اپنی کتاب میں جواب دینے اور تردید کی غرض سے نقل کیا تھا۔ سچ پوچھئے تو کتاب میں ایک بات بھی ایسی نہیں جس میں الحاد کا شائبہ بھی پایا جاتا ہو۔ بلکہ اس کے پڑھنے سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ مصنف پکا مومن ہے اور ایسا مومن ہے جسے دوسرے مسلمانوں کے ایمان کو بچانے کی لگن لگی ہوئی ہے۔(۸۶)

مولانا حمید الدین فراہی کو جن عبارتوں کی بنیاد پر موجب کفر قرار دیا گیا وہ اصلاً مولانا کے چند غیر مرتب اشارات تھے جنہیں مولانا اصلاحی نے اردو میں منتقل کر کے مجلہ الاصلاح میں شائع کر دیا تھا اور اسی کے ساتھ یہ تنبیہی نوٹ بھی درج کر دیا کہ یہ ناتمام حالت میں ہے، اس لیے کہیں کہیں عبارت چھوٹی ہوئی ہے، بعض جگہ سخت ابہام ہے۔(۸۷) لیکن اس نوٹ کے باوجود بھی انہی غیر مرتب اشارات کو بنیاد بنا کر مولانا فراہی کو کافر قرار دیا گیا۔ جس نے مسلسل چالیس برس تک قرآن مجید کی خدمت کی۔ جس نے معارف قرآنی کی تحقیق میں سیاہ بالوں کو سفید کیا۔ جس کی تفسیروں سے عرب و عجم کے ہزاروں مسلمانوں میں تدبر فی القرآن کا ذوق پیدا ہوا، جس کی تحریروں کا ایک ایک لفظ گواہی دے رہا ہے کہ وہ قرآن کا عاشق ہے اور اس کے لفظ لفظ پر جاں نثار کرتا ہے۔ اگر ایسے لوگ بھی

مسلمان نہیں تو اس زمین پر ہم مسلمانوں کو کہاں تلاش کریں۔(۸۸)

یہاں پر مولانا فراہی کی عبارتوں کو طوالت کے خوف سے نقل نہیں کر رہے ہیں۔ صرف اتنا یہاں بتا دینا مناسب ہوگا کہ اس فتوی میں تین باتوں کو بنیاد بنایا گیا ہے۔

۱۔ اسماء سور سے سورت کے مضمون و موضوع کی طرف ذہن منتقل نہیں ہوتا۔(۸۹)

۲۔ بعض مواقع پر بندش و قافیہ کے لیے غیر انسب الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں۔(۹۰)

۳۔ موجودہ تقسیم رکوع و اجزاء نظم و ربط مضامین میں مخل ہوتی ہے، اس لیے طالب نظم کے لیے اس کی پابندی لازمی نہیں۔(۹۱)

مولانا فراہی کے ان خیالات سے اختلاف تو کیا جا سکتا ہے، لیکن اس میں کوئی ایسی بات نہیں ہے کہ جس کی وجہ سے مولانا فراہی پر کفر کا فتوٰی عائد کر دیا جائے، اس فتوی کا جناب غلام احمد پرویز صاحب نے جائزہ لیتے ہوئے دلائل کی روشنی میں یہ ثابت کیا ہے کہ مولانا فراہی کے ان خیالات کی بنیاد پر انہیں کافر قرار دینا حد درجہ ظلم و زیادتی ہے۔(۹۲) اسی طرح "الکلام" کی جلی عبارتوں کو پیش نظر رکھ کر علامہ شبلیؒ کو کفر کی حدود میں داخل کر دیا گیا ہے، ان کا مولانا بدر الدین اصلاحی نے تجزیہ کرتے ہوئے بتایا کہ یہ عبارتیں علامہ کی ہیں ہی نہیں بلکہ یہ ملاحدہ کے اقتباسات ہیں جنہیں علامہ نے تردید کی غرض سے اپنی کتاب میں نقل کیا ہے، اس لیے یہ فتوی تکفیر یکسر بے بصیرتی اور سہل انگاری پر مبنی ہے اور علامہ کو کافر قرار دینا کس قدر کار خیانت ہے۔(۹۳) لیکن بعد میں جب مولانا اشرف علی تھانویؒ اور مولانا شبیر احمد عثمانی کو اس کا علم ہوا تو انہوں نے اس فتوٰی سے رجوع کیا۔(۹۴) اورمولانا لطف اللہ جن کے اس فتوٰی پر دستخط تھے، انہوں نے مجلّہ "الاصلاح" میں ایک خط لکھ کر اس سے برأت کا اظہار کیا اور اپنے اس کار عبث پر نادم بھی ہوئے۔(۹۵) اس فتوٰی تکفیر پر ہندوستان کے چوٹی کے علماء نے اظہار افسوس بھی کیا، اس سلسلہ کی تحریروں میں سے الاصلاح میں مولانا ابوالکلام آزاد جو مولانا حسین احمد مدنی، مولانا ابو المحاسن محمد سجاد (نائب امیر شریعت بہار) مولانا مناظر احسن گیلانی اور مولانا عبدالماجد دریابادی کی تحریریں شائع ہوئیں۔(۹۶) اسی فتوٰی سے متعلق الاصلاح کے دو شذرات میں بھی بحث کی گئی۔(۹۷)

اب آیئے یہ دیکھتے ہیں کہ مولانا کے عزیز دوست اور شاگرد سید صاحب پر اس کا کیا اثر ہوا اور وہ اس باب میں کیا فرماتے ہیں۔ چنانچہ ایک خط میں مولانا دریا بادی کو لکھتے ہیں کہ ''سرائے میر کی فتنہ تکفیر کی روداد تو آپ تک پہنچی ہوگی، مجھے مولانا شبلی کی تکفیر کا غم نہیں کہ وہ متکلم تھے اور وہ کون متکلم ہے جو کافر نہ بنا۔ غم مولانا حمید الدین صاحب کی تکفیر کا ہے، جن کو ہم لوگ دیوبند کے بڑے بڑے اکابر سے علم و فضل اور زہد و اتقا میں کمتر نہیں جانتے۔(۹۸)

سید صاحب کو اس فتوی پر حددرجہ غم اور قلق تھا اور انہوں نے علماء کرام کے اس فعل کو حد سے زیادہ جرأتمندانہ اقدام قرار دیا، سیّد صاحب فرماتے ہیں کہ'' مولانا حمید الدین صاحب پر جو نہ صرف علم و فضل میں یکتائے زمانہ تھے بلکہ اپنی صحت اعتقاد اور زہد و تقوی کے لحاظ سے خواص امت میں سے تھے، بعض الفاظ کی بناء پر کفر کا فتوی مرتب کرنا حد سے زیادہ جرأت ہے''۔(۹۹)

تکفیر کا یہ فتوٰی دراصل مدارس کی باہمی عداوت و رقابت کا نتیجہ ہے، سرائے میر ہی کے ایک مدرسہ نے مدرسۃ الاصلاح کے خلاف یہ شاخسانہ کھڑا کیا کیونکہ یہ مدرسہ مدرسۃ الاصلاح کی عداوت و مخالفت میں قائم کیا گیا ہے، اس کی یہ کوشش تھی کہ اس کے خلاف ایک ایسا شوشہ چھوڑا جائے کہ عوام اس سے بیزار ہوکر چندہ دینا اور اپنی اولاد کو ان میں پڑھانا بند کر دیں۔ سیّد صاحب نے ان چیزوں کی طرف ان لفظوں میں اشارہ کیا ہے کہ ''آس پاس میں ''علماء زمانہ'' کی کمی نہیں انہوں نے اس کے مقابل دوسرا مدرسہ قائم کیا اور اپنے مدرسہ کو چلانے کے لیے یا اپنے زعم میں نیک نیتی سے وقتاً فوقتاً مدرسۃ الاصلاح کے خلاف غلط افواہیں پھیلا کر مسلمانوں کو اس کی امداد سے روکنے کی کوشش کرتے رہے۔ لیکن دشمن اگر قوی است نگہبان قوی تر است۔ ان کی ہر کوشش ناکام ہوتی رہی اور مدرسۃ الاصلاح کا کام بڑھتا ہی رہا''۔(۱۰۰)

سید صاحب نے مدارس کی اس باہمی رقابت پر حد درجہ اظہار افسوس کیا۔ اور بتایا کہ بات اس حد تک جا پہنچی ہے کہ ذمہ داران مدارس آپس میں ایک دوسرے پر کفر کے فتاوے عائد کرنے لگے ہیں جو حد درجہ قابل افسوس ہے۔(۱۰۱)

سید صاحب نے یہ بھی بتایا کہ یہ فتوی کن لوگوں کی جانب سے منظر عام پر آیا اور سرائے میر کے اس مدرسہ نے مخالفت میں اور کچھ کہا گیا۔ ان کے الفاظ ملاحظہ کریں ”یہ جدید ترقی مخالفوں کے سامان ہیزم کشی، کے لیے آگ ثابت ہوئی۔ انہوں نے اس کی تباہی کے لیے اپنے آخری بے پناہ حربہ کافرگری) کو استعمال کیا اور تھانہ بھون، سہارنپور، ۔۔۔ بمبئی اور دیوبند وغیرہ کے چند علماء کو مولانا شبلی اور مولانا حمید الدین کی چند بے محل عبارتیں دکھلا کر دونوں کی تکفیر کا فتوی لے آئے۔ جس پر علماء کرام کی تصدیقی مہریں ثبت ہیں۔ پھر دہلی، میرٹھ، وغیرہ سے ایک درجن ایسے علماء بلا کر لے آئے جو اپنے مخالفوں کو بہتر سے بہتر مذہبی اور اخلاقی ۹ گالیاں دے سکیں۔ چنانچہ مدرسہ کے قریب کی ایک زمین میں جلسہ جما کر تین روز تک پیہم ان دو مرحومین کو اور ان کے تعلق سے مدرسہ کو بدتر سے بدتر کلمات ناشائستہ سے یاد فرماتے رہے“۔ (۱۰۲)

سیّد صاحب کو اس فتوی پر غیر معمولی رنج تو تھا ہی کیونکہ مولانا فراہی سے ان کے نہایت گہرے مراسم تھے اور دوسری طرف مولانا اشرف علی تھانوی ؒ سے بیعت بھی تھے، اس لیے ان کی یہ کوشش رہی کہ اس فتوی تکفیر سے رجوع کر لیا جائے، اور مولانا تھانوی کو کسی طرح کی گزند بھی نہ پہنچے۔ اس سلسلہ میں مولانا دریابادی نے بڑی قابل تحسین خدمت انجام دی۔ چنانچہ مولانا امین احسن اصلاحی کے متعلق مولانا دریابادی کو لکھتے ہیں کہ ” امین احسن صاحب آئے تھے۔ مولانا کی تحریر لائے تھے۔ ان کو سمجھا دیا ہے کہ جوش و خروش سے کام نہ لیں“۔ (۱۰۳) یعنی سیّد صاحب نے مولانا اصلاحی کو کسی ایسی تحریر کو منظر عام پر لانے سے منع کیا کہ جس سے مولانا تھانوی کی شخصیت مجروح ہو۔ وہ چاہتے تھے کہ نہایت خوش اسلوبی سے یہ فتوی واپس ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ جب مولانا دریا بادی کی کوششوں سے یہ فتوی واپس لیا گیا تو سید صاحب نے ان کا تہہ دل سے شکریہ ادا کیا۔ ان کے ایک کارڈ کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں کہ ” کارڈ ملا اور اس سے پہلے بھی ایک عنایت نامہ آیا تھا، آپ نے اس بارے میں جو یادگار خدمت انجام دی ہے، اس کا شکریہ ہر صلح پسند کو ادا کرنا چاہیے۔ میرے لیے بڑی مشکل، دوگونہ تعلقات کو نباہنا ہے۔ بہرحال آئندہ شذرات میں بچا بچا کر کچھ لکھا ہے۔

نعمانی و فراہی کے عقائد پر مفصل مضامین لکھنے کی ضرورت کیا اور فرصت کسے۔ (۱۰۴) "تلك امة قد خلت لها ما كسبت و لكم ما كسبتم" مولانا شبلی کے رفع الزام پر ایک اصلاحی نے طویل مضمون لکھا ہے جو شاید الاصلاح میں چھپے"۔ (۱۰۵)

مولانا تھانوی نے جب اس فتوی کو واپس لیا تو اس پر سید صاحب کو بڑی خوشی ہوئی اور مولانا تھانوی کے اس عمل کو سراہا بھی۔ سید صاحب شذرات میں یوں رقمطراز ہیں " یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ حضرت مولانا نے فتوی کے بعض جوابی تشریحی مضامین پڑھنے کے بعد اپنے مسلک توسع کی بناء پر ان دونوں بزرگوں کی تکفیر کے فتوی سے رجوع فرمایا۔

اس زمانہ میں جب کہ اعتراف حق کبریت احمر ہے، حضرت مولانا تھانوی کی یہ حق پسندی بے حد قابل قدر ہے۔ (۱۰۶)

زہد و تقویٰ

مولانا حمید الدین فراہی کا تعلق ایک زمین دار گھرانے سے تھا، علم و فضل ان کا طرہ امتیاز تھا اور اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ ان تمام چیزوں کے باوجود کبر و نخوت کا ان کے یہاں کوئی تصور نہ تھا۔ وہ نمود و نمائش اور شہرت و ناموری سے ہمیشہ دور رہے، گوشہ نشینی ہی ان کی متاع عزیز تھی، اسی لیے علامہ شبلی کو یہ کہنا پڑا کہ " دس ہزار روپیہ نقد معاوضہ دیتے ہیں، میں نے اپنی صحت کے لحاظ سے انکار کیا، اس کے لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ اگر تم پبلک میں آ جاؤ تو اس قسم کے کاموں سے اچھی طرح آزاد زندگی بسر کر سکو، لیکن تم کو جنبش نہیں ہوتی"۔ (۱۰۷)

سید صاحب کے انتقال پر مولانا دریابادی نے صدق جدید میں یہ لکھا کہ " ہم لوگوں کا مختصر سا قافلہ بے سالار رہ گیا" اس مختصر سے قافلہ میں مولانا حمید الدین فراہی، مولانا عبدالباری ندوی ، مولانا مسعود علی ندوی اور خود مولانا دریابادی شامل تھے، اس قافلہ میں مولانا فراہی کی کیا حیثیت تھی۔ وہ دریا بادی صاحب کی زبانی سنیے۔" مولانا حمید الدین فراہی سن و سال و علم و فضل میں، زہد و تقوی میں سب سے بڑھے ہوئے تھے اور اس پر مولانا (علامہ شبلی نعمانی) کے عزیز قریب بھی"۔ (۱۰۸)

سید صاحب نے ایک جگہ مولانا فراہی کی دینداری کی اس طرح عکاسی کی ہے، جناب مولانا حسین احمد صاحب ۹ شوال کو ایک عزیز کی تقریب میں دو تین روز کی صحبت نصیب ہوئی۔ یہاں کی مسجد میں کئی وقتوں کی نماز ادا فرمائی، مولانا حمید الدین کی وفات کے بعد سے نمازوں میں اب لطف ملا''۔(۱۰۹)

سید صاحب نے حیدر آباد کے قیام کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہاں بھی مولانا نے خاموشی کو پسند کیا اور اگر چاہتے تو بہت کچھ حاصل کر سکتے تھے۔ سید اس قیام پر یوں اظہار خیال کرتے ہیں: '' مولانا حمید الدین صاحب فطرتاً نہایت تنہائی پسند، گوشہ نشین اور بڑے لوگوں سے ملنے جلنے سے وہ عمداً بچتے تھے۔ اس لیے حیدر آباد دکن جا کر بھی جو ایک عالم کا مرکز اور خوش قسمتیوں کا عجائب خانہ ہے، ان کی حالت میں کوئی تغیر نہیں ہوا۔ سو اپنے حلقہ کے خاص لوگوں کے جن سے ان کو اتحاد و ذوق تھا اور کہیں آتے جاتے نہیں تھے''۔(۱۱۰)

مولانا نے اپنے وطن آنے کے لیے جب دارالعلوم حیدر آباد سے استعفیٰ دیا تو ذمہ دار ارکان حکومت چاہتے تھے کہ مولانا قیام کریں۔ اس استغناء کا سیّد صاحب نے اس طرح ذکر کیا ہے'' مگر وہ اپنی طبعی بے نیازی اور استغناء کو راہ دے کر متوکل علی اللہ ایک ہزار ماہوار کی جگہ چھوڑ کر وطن چلے آئے۔ حیدر آباد میں جب تک وہ رہے، بے ہمہ اور باہمہ رہے۔علم کی قدر و منزلت اور بے نیازی کو انہوں نے پوری طرح نباہا''۔(۱۱۱)

اسی چیز کو سید صاحب نے ایک دوسرے طرز میں اس طرح بیان کیا ہے'' انہوں نے گراں بہا معاوضہ '' اعلی اعزاز'' دنیوی منصب اور شہروں کی لذت بخش زندگی کو چھوڑ کر سادگی، قناعت اور گمنامی کے ساتھ اپنی عمر کا ایک جگ کیوں ایک دیہات میں بیٹھ کر عربی کے ایک مدرسہ کی خدمت گزاری میں بسر کر دیا''۔(۱۱۲)

سید صاحب کے مذکورہ اقتباسات کی روشنی میں دیکھا جائے تو دو چیزیں سامنے آتی ہیں ایک تو انہیں دنیوی عزت و شہرت سے حد درجہ بے نیازی تھی اور دوسرے تقوی اور خشیت الٰہی ہی ان کی اصل شناخت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنی تمام تر زندگی قرآن کریم کے تفکر و تدبر میں لگا دی۔

مولانا حمید الدین فراہی کی وفات

مولانا فراہی کی وفات کو علمی دنیا میں شدت سے محسوس کیا گیا، سید صاحب نے اس حادثہ کو ابن تیمیہ کے حادثہ کے مترادف قرار دیا اور بتایا کہ آج عربی کا فاضل یگانہ اور انگریزی کا گریجوایٹ زہد و ورع کی تصویر، فضل و کمال کا مجسمہ، فارسی کا بلبل شیراز اور عربی کا سوق عکاظ اس دنیا سے رخصت ہو گیا ہے۔ یہ بات پیچھے آ چکی ہے کہ سید صاحب کے چونکہ مولانا سے ذاتی اور نجی تعلقات تھے۔ اس لیے انہیں اس حادثے سے غیر معمولی قلق ہوا۔ چنانچہ انہیں جب مولانا کی بیماری کی اطلاع ملی اور پتہ چلا کہ علاج کے لیے متھرا اپنے ایک ہم وطن ڈاکٹر کے پاس تشریف لے گئے ہیں تو وہ بھی چل پڑے اس واقعہ کا ذکر مولانا دریابادی سے اس طرح کرتے ہیں:

> " مولانا حمید الدین صاحب سخت بیمار ہو کر اپنے ہم وطن ڈاکٹر سے علاج کے لیے متھرا ڈاکٹر حفیظ اللہ صاحب کے پاس گئے تھے۔ آپریشن کئی ہوئے، حالت نازک ہے، میں آج گاڑی سے متھرا جا رہا ہوں، واپسی پر لکھنو ہو کر ہوگی"۔ (۱۱۳)

سید صاحب متھرا تو پہنچ گئے لیکن انہیں اس کا شدید افسوس رہا کہ وہ مولانا کا آخری دیدار نہ کر سکے۔ اپنے دلی جذبات و احساسات کو ان لفظوں میں قلمبند کیا ہے:

> " افسوس کہ متھرا کے بتکدہ میں اسلام کا روشن ستارہ غروب ہوگیا، مولانا حمید الدین صاحب نے پرسوں وفات پائی۔ آج پہنچا زیارت آخریں سے محروم رہا۔
>
> آہ! کہ علم کا مزہ جاتا رہا، ترجمان رخصت ہوگیا۔ آج لکھنو جا رہا ہوں، چند روز رہوں گا۔
>
> ۱۱ نومبر پرسوں شب کے گیارہ بجے انتقال ہوا اور کل بارہ بجے دن کو تجہیز و تکفین ہوئی"۔ (۱۱۴)

سید صاحب نے مولانا فراہی کے انتقال پر معارف کے شذرات میں اپنے قلبی احساسات اور مولانا کی علمی قدر و منزلت کو اہل علم کے حضور پیش کیا۔

حواشی و تعلیقات

۱۔ مکاتیب شبلی (باہتمام مولوی مسعود علی ندوی) طبع دوم، و مطبع معارف، اعظم گڑھ، ۱۹۲۷ء۔ ۲/۱۳۵

۲۔ حیات سلیمان۔ شاہ معین الدین احمد ندوی۔ دارالمصنفین، (اعظم گڑھ) بدون و تاریخ) ص ۲۵۲

۳۔ مدرسۃ الاصلاح پر سید صاحب کے اظہار خیال کے لیے دیکھیے، حیات شبلی، سید سلیمان ندوی۔ دارالمصنفین، اعظم گڑھ (بدون تاریخ) ص ۶۸۱-۶۸۸

۴۔ حیات سلیمان، ص ۲۵۲

مختصر حیات حمید۔ عبدالرحمان ناصر اصلاحی۔ مطبع معارف، اعظم گڑھ (بدون تاریخ) ص۱۰

۵۔ بزم رفتگان۔ صباح الدین عبدالرحمٰن پہلی بار مکتبہ جامعہ نئی دہلی۔ ۱۹۸۱ء، ۱/۱۶۳-۱۶۴

۶۔ سیرۃ السید کے کچھ اصول سبق۔ مولانا عبدالباری ندوی۔ معارف (سلیمان نمبر) دارالمصنفین، اعظم گڑھ ۵/۷۵، ص۸۵

۷۔ تحریک ندوہ اور سید صاحب، مجیب اللہ ندوی۔ معارف (سلیمان نمبر) دارالمصنفین، اعظم گڑھ، مئی ۱۹۵۵ء۔ ۵/۷۵، ص ۲۵۲-۲۸۳

۸۔ مختصر حیات حمید۔ عبدالرحمان ناصر اصلاحی۔ مطبع معارف اعظم گڑھ (بدون تاریخ) ص۱، الکویت۔ ۱۴۰۰ھ/۱۹۸۰ء، ص۱۰

۹۔ الامعان فی اقسام القرآن۔ الشیخ المعلم عبدالحمید الفراہی۔ (مقدمہ سید سلیمان ندوی) دارالقر[illegible]ت،

۱۰۔ الصلوۃ علی ترجمان القرآن، مولانا حمید الدین، سید سلیمان ندوی، معارف، دارالمصنفین، اعظم گڑھ۔ ۱۹۳۰ء۔ ۶/۲۶، ص ۳۲۲۔ یہی مقالہ بعد میں یادرفتگاں (میں شامل کیا گیا)۔ سید سلیمان ندوی۔ ص ۱۱۰۔

۱۱۔ کتابیات فراہی۔ ڈاکٹر ظفر الاسلام اصلاحی، طبع اول۔ ادارہ علوم القرآن، اعظم گڑھ، ۱۹۹۱ء۔ ص ۳۱۔ ۴۶

۱۲۔ وضاحت کے لیے دیکھیے۔ علامہ حمید الدین فراہی، حیات و افکار (تصانیف فراہی کا غیر مطبوعہ حصہ۔ ڈاکٹر محمد اجمل اصلاحی) انجمن طلبہ قدیم۔ مدرسۃ الاصلاح۔ سرائے میر اعظم گڑھ ۱۹۹۲ء۔ ص ۵۷-۹۶

۱۳۔ مشاہیر علم کی محسن کتابیں۔ محمد عمران ندوی۔ معارف پریس، اعظم گڑھ۔ (بدون تاریخ) ص۱۲۔

۱۴۔ سیرۃ النبی۔ سید سلیمان ندوی۔ مطبع معارف، اعظم گڑھ، طبع پنجم۔ ۱۳۹۳ھ/۱۹۷۳ء، ۴/۱۵۰۰۔

۱۵۔ تفسیر نظام القرآن۔ حمید الدین فراہی، ترجمہ از امین احسن اصلاحی، دائرہ حمیدیہ مدرسۃ الاصلاح، سرائے اعظم گڑھ، ۱۹۹۰ء، ص ۵۳۱

۱۶۔ سیرۃ النبیؐ ، سید سلیمان ندوی۔ ۵۰۲/۴

۱۷۔ تفسیر نظام القرآن۔ ص ۵۳۱

۱۸۔ ایضاً ۔ ص ۵۳۱

۱۹۔ پرانے چراغ۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی۔ بار اول۔ مکتبہ فردوس، لکھنو ۱۹۷۵ء۔ ص ۵۸

۲۰۔ تحریک ندوۃ العلماء اور سید صاحب، مولوی حافظ مجیب اللہ ندوی۔ معارف (سلیمان نمبر) مئی ۱۹۵۵ء۔ دارالمصنفین، اعظم گڑھ۔ ۵/۷۵، ص ۲۷۳

تحریک ندوہ اور سید صاحب۔ مجیب اللہ ندوی۔ معارف (سلیمان نمبر) مئی ۱۹۵۵ء، اعظم گڑھ ۵/۵۷، ص ۲۷۳

۲۱۔ مکاتیب سید سلیمان ندوی۔ مرتبہ مسعود عالم ندوی۔ اشاعت اوّل، مکتبہ چراغ، مئی ۱۹۵۴ء۔ لاہور ، ص ۳۲

۲۲۔ کتابیات فراہی، ص ۳۳

۲۳۔ سید صاحب کی یہ بات کہ مصری نسخہ (سن طباعت ۱۹۳۰ء) سے قبل امعان فی اقسام القرآن کہیں سے شائع نہیں ہوئی، درست نہیں ہے، کیونکہ ۱۹۱۱ء میں عربی نسخہ علی گڑھ سے شائع ہو چکا ہے۔ دیکھیے کتابیات فراہی، ص ۳۳۔ اس کے علاوہ اس کی تردید ان کے مضمون بعنوان ''مولانا حمید الدین فراہی'' سے ہو جاتی ہے۔ جس میں انہوں نے امعان کے متعلق لکھا ہے کہ یہ کتاب پہلی بار ۱۹۰۶ء میں شائع ہوئی۔ دیکھیے، معارف۔ جنوری ۱۹۳۱ء۔ ۲۷/۱، ص ۱۴

۲۴۔ مکاتیب سید سلیمان ندوی، ص ۴۲

۲۵۔ ایضاً ،ص ۵۹

۲۶۔ ایضاً ،ص ۴۹

۲۷۔ مختصر حیات حمید۔ ص ۸-۹

۲۸۔ ادبیات مودودی (مرتبہ خورشید احمد) مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی، بار اوّل ۱۹۸۰ء۔ ص ۵۲-۵۳

۲۹۔ مختصر حیات حمید۔ ص ۵

۳۰۔ مسٹر بیک کی شخصیت کے لیے دیکھیے۔ پرنسپل تھیوڈور بیک۔ نفیس بانو۔ ناموران علی گڑھ (پہلا کارواں) فکر و نظر۔ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔ ص ۲۶۹-۲۷۰

۳۱۔ مختصر حیات حمید۔ ص ۵-۶

۳۲۔ آرنلڈ کی شخصیت کے لیے دیکھیے، پرنسپل سر ٹامس واکر آرنلڈ۔ ڈاکٹر عبدالباری۔ ناموران علی گڑھ (پہلا کارواں) ص ۲۴۳-۲۵۸

۳۳۔ مختصر حیات حمید۔ ص ۶

۳۴۔ ایضاً، ص ۷

۳۵۔ مولانا فراہی۔ امین احسن اصلاحی۔ مختصر حیات حمید۔ ص ۳۵

۳۶۔ محمد عارف عمری (رفیق دارالمصنفین) نے اپنے یہ خیالات سہ روزہ دعوت دہلی ۱۹۹۸ء کے کسی شمارہ میں پیش کیے۔

۳۷۔ جوزف ہارویز کی شخصیت کے لیے دیکھیے۔ جوزف ہارویز۔ ظفر الاسلام اصلاحی۔ ناموران علی گڑھ (تیسرا کارواں) فکر و نظر۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ ۱۹۹۱ء۔ ص ۳۱-۴۲

۳۸۔ مختصر حیات حمید۔ ص ۷-۸

۳۹۔ ایضاً۔ ص۳

۴۰۔ مولانا فاروق چریا کوٹی پر دیکھیے۔ ایک اور آفتاب علم غروب ہوگیا۔ مقالات شبلی۔ مطبع معارف اعظم گڑھ ۱۹۳۸ء۔ ص ۳۷-۳۸

۴۱۔ مختصر حیات حمید۔ ص ۳-۴

۴۲۔ ایضاً۔ ص ۶

۴۳۔ حبیب الرحمان خاں شیروانی کے لیے دیکھیے۔ حبیب الرحمان خاں شیروانی، ڈاکٹر عبدالباری، ناموراں علی گڑھ (دوسرا کارواں) فکر و نظر۔ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔ ص ۵۱-۶۴

۴۴۔ مکاتیب شبلی۔ مکتوب بنام شیروانی۔ ۱/۱۲۴

۴۵۔ مکاتیب شبلی۔ مکتوب ۲۴، ۲/۱۷

۴۶۔ رسالہ الامعان فی اقسام القرآن۔ ص ۸-۹

۴۷۔ مختصر حیات حمید۔ ص ۹-۱۰

۴۸۔ مکاتیب شبلی (حاشیہ) ۱/۲

۴۹۔ نظام القرآن و تاویل الفرقان (سورہ قیامہ اور سورہ ابی لہب) سید رشید رضا۔ مجلہ المنار، مصر، ۲/۱۲، ۲۲مارچ۱۹۰۹ء۔ ص ۱۳۵-۱۳۶

۵۰۔ مختصر حیات حمید۔ ص ۱۰

۵۱۔ ایضاً، ص ۱۸

۵۲۔ ایضاً۔ ص ۱۱

۵۳۔ خسرونامہ۔ (تبصرہ از) سید سلیمان ندوی۔ معارف۔ اکتوبر ۱۹۱۶ء۔ ۴/۱، ص ۵۸-۵۹

۵۴۔ جمہرۃ البلاغۃ، پروفیسر محمد راشد ندوی کا مقالہ حد درجہ تحسین کے لائق ہے۔ دیکھیے: مولانا فراہی کے تنقیدی نظریات، جمہرۃ البلاغہ، کی روشنی میں۔ علامہ حمید الدین فراہی، حیات و افکار (مقالات فراہی سیمینار) ص ۵۴۳-۵۴۶

۵۵۔ مکاتیب سلیمان ندوی۔ ص ۱۷۳

۵۶۔ ایضاً۔ ص ۱۸۰

۵۷۔ مکتوبات سلیمانی۔ (بنام مولانا عبدالماجد دریا بادی) مرتبہ عبدالماجد دریا بادی، شاہی پریس، لکھنو۔ ۱۹۳۸ء، ۸۹/۱

۵۸۔ ایضاً ۸۹/۱

۵۹۔ اس کی وضاحت کے لیے دیکھیے۔ کتابیات فراہی

۶۰۔ وضاحت کے لیے خاکسار کا مضمون: مولانا فراہی مکاتیب شبلی کے آئینہ میں۔ علامہ حمید الدین فراہی حیات و افکار (مقالات فراہی سیمینار) ص ۴۴۲-۴۵۴، نیز دیکھیے سیرۃ النبی شبلی میں فکر فراہی۔ پروفیسر یسین مظہر صدیقی۔ علامہ حمید الدین فراہی، حیات و افکار (مقالات فراہی سیمینار) ص۴۱۶-۴۴۱

۶۱۔ سیرۃ النبی اور چند جدید عربی کتب سیرت، محمد راشد ندوی، طبع اوّل، دارالعلوم، تاج المساجد، بھوپال، ۱۹۸۶ء، ص۲۹۶

۶۲۔ مطالعہ سلیمانی (مقالات سلیمان) مرتبہ، مسعود الرحمان خاں ندوی۔ محمد حسان خاں،

۶۳۔ وضاحت کے لیے دیکھیے حیات شبلی۔ ص ۲۲-۲۳-۷، نیز دیکھیے شبلی نامہ۔ شیخ محمد اکرام۔ نامہ آفس۔ محمد علی روڈ، بمبئی (بدون تاریخ) ص ۲۶۸-۲۶۹

۶۴۔ مکاتیب شبلی (بنام ابوالکلام آزاد) سید سلیمان ندوی، طبع دوم۔ مطبع معارف اعظم گڑھ ۱۹۲۸ء۔ ۲۸۹/۲

۶۵۔ حیات شبلی، ص ۲۲-۲۳-۷ نیز دیکھیے: حیات سلطانی۔ محمد امین زبیری، عزیزی پریس آگرہ۔ ۱۳۵۸ھ/۱۹۳۹ء۔ ص ۱۳۱

۶۶۔ شبلی نامہ، ص ۲۶۶

۶۷۔ بزم رفتگاں۔ ص ۱۶۴

۶۸۔ مشاہیر اہل علم کی محسن کتابیں۔ ص ۱۲

۶۹۔ سیرت النبی۔ سید سلیمان ندوی۔ طبع سوم۔ مطبع اعظم گڑھ۔ ۱۹۶۷ء۔ ۱/۳

۷۰۔ مختصر حیات حمید۔ ص ۱۲-۱۳

۷۱۔ ایضاً۔ ص ۱۷-۱۸

۷۲۔ ایضاً۔ ص ۱۸

۷۳۔ مختصر حیات حمید۔ ص ۱۸

۷۴۔ ایضاً۔ ص ۱۸-۱۹

۷۵۔ مکاتیب شبلی۔ ۵۴/۲

۷۶۔ حیات شبلی، ص ۶۸۷ نیز دیکھیے، حیات سلیمان ص ۹۶

۷۷۔ الصلوۃ علی ترجمان القرآن۔ سید سلیمان ندوی۔ معارف ۔ دارالمصنفین اعظم گڑھ۔ نومبر ۱۹۳۰ء۔ ۶/۲۶، ص ۳۲۴

۷۸۔ حیات سلیمان۔ ص ۵۹۰

۷۹۔ مکاتیب شبلی ۔ ۳۳/۲

۸۰۔ ایضاً۔ ۱۳۵/۲

۸۱۔ مختصر حیات حمید۔ ص ۲۱-۲۲

۸۲۔ ایضاً۔ ص۲۲

۸۳۔ ایضاً، وضاحت کے لیے دیکھیے صفحات ۲۳-۲۵

۸۴۔ دو عمدہ مضمون۔ ناشر، بدر الدین اصلاحی باہتمام عبدالاحد اصلاحی(کافر گری۔ غلام احمد پرویز) مطبع اصلاح، سرائے میر اعظم گڑھ۔ ص ۲۳-۲۴

۸۵۔ ایضاً، فتنہ تکفیر، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، ص ۱۳-۱۴

۸۶۔ ایضاً ،ص ۱۵

۸۷۔ قرآنی مقالات۔ ص ۸۲

۸۸۔ دو عمدہ مضمون (فتنہ تکفیر مولانا ابوالاعلیٰ مودودی) ص ۱۲

۸۹۔ خیالات اثناء ترجمہ قرآن حمید الدین

۹۰۔ خیالات اثناء ترجمہ قرآن۔ حمید الدین فراہی (قرآنی مقالات۔ ادارہ علوم القرآن۔ سرسید نگر وعلی گڑھ، طبع اوّل۔ ۱۹۹۱ء، ص ۱۸

۹۱۔ مجلّہ الاصلاح۔ اگست ۱۹۳۶ء

۹۲۔ وضاحت کے لیے دیکھیے۔ دو عمدہ مضمون۔ ص ۲۳-۳۴

۹۳۔ وضاحت کے لیے دیکھیے۔ علامہ شبلی پر فتویٰ تکفیر کی تردید۔ مولوی بدر الدین اصلاحی۔ مجلّہ الاصلاح۔ سرائے میر اعظم گڑھ۔ اگست ۔ ۱۹۳۶ء، ۸/۱، ص۲۹-۵۴

۹۴۔ وضاحت کے لیے دیکھیے: مجلّہ الاصلاح، ستمبر ۱۹۳۶ء۔ ۹/۱، ص۲

۹۵۔ ایضاً، ۹/۱، ص۲

۹۶۔ مجلّہ الاصلاح۔ اگست ۱۹۳۶ء۔ ۸/۱، ص ۵۶-۶۱

۹۷۔ فتنہ تکفیر۔ امین احسن اصلاحی۔ مجلّہ الاصلاح۔ جولائی ۱۹۳۶ء۔ ۷/۱، ص ۱-۸

فتنہ تکفیر (بعض اکابر کی رائیں) امین احسن اصلاحی۔ مجلّہ الاصلاح۔ اگست ۱۹۳۶ء۔ ۸/۱، ص ۵۶-۶۱

۹۸۔ مکتوبات سلیمانی (مرتبہ عبدالماجد دریا بادی) شاہی پریس لکھنو۔ ۱۹۶۷ء۔ ۵۳/۲-۵۴

۹۹۔ غوغائے تکفیر۔ سید سلیمان ندوی۔ مجلّہ الاصلاح۔ اگست ۱۹۳۶۔ ۸/۱، ص ۲۷

۱۰۰۔ شذرات۔ سید سلیمان ندوی۔ مجلّہ معارف، دارالمصنفین، اعظم گڑھ۔ اگست ۱۹۳۶ء۔ ۳۸/۲، ص ۸۴۔

۱۰۱۔ غوغائے تکفیر، سید سلیمان ندوی۔ الاصلاح۔ اگست ۱۹۳۶ء، ۸/۱، ص ۲۵

۱۰۲۔ مجلّہ معارف، اگست ۱۹۳۶ء۔ ۳۸/۲، ص ۸۴

۱۰۳۔ مکتوبات سلیمانی۔ ۵۷/۲

۱۰۴۔ ایضاً۔ ۵۵/۲۔

۱۰۵۔ یہ مضمون مولانا بدر الدین اصلاحی کا تھا جو مجلہ الاصلاح، (اگست ۱۹۳۶ء۔ ۸/۱، ص ۵۶-۶۱) میں شائع ہوا۔

۱۰۶۔ شذرات۔ سید سلیمان ندوی۔ مجلہ معارف۔ دارالمصنفین، اعظم گڑھ۔ ستمبر ۱۹۳۶ء، ۳/۳۸

۱۰۷۔ مکاتیب شبلی (بنام حمید الدین فراہی) ۷/۲

۱۰۸۔ وفیات ماجدی۔ مولانا عبدالماجد دریا بادی (مرتبہ حکیم عبدالقوی دریا بادی) نیو۔ یونائیٹڈ انڈیا پریس، لکھنو۔ ۱۹۷۸ء۔ ص ۶۹

۱۰۹۔ مکتوبات سلیمانی۔ ۱۸/۲

۱۱۰۔ مختصر حیات حمید۔ ص ۱۴

۱۱۱۔ ایضاً۔ ص ۱۹

۱۱۲۔ ایضاً۔ ص ۲۲

۱۱۳۔ مکتوبات سلیمانی۔ ۲۶۸/۱

۱۱۴۔ ایضاً، ۷۸۶/۱